عالم اسلام کی تجدیدی اور اصلاحی تحریکات

اپنے سیاسی اور اجتماعی پس منظر میں

محمود احمد غازی

(۱)

اسلام ایک ایسا دین ہے جو فکر و عقیدہ سے زیادہ عمل اور کردار پر زور دیتا ہے، اس کی تعلیمات سیدھی سادھی، واضح اور عام فہم ہیں۔ ان میں عقلی کاوشوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کے لئے کچھ زیادہ گنجائش نہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام دنیائے انسانیت کی تاریخ کا وہ واحد عملی نظام زندگی ہے جو حیات انسانی کے جملہ انفرادی و اجتماعی پہلوؤں پر حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ فطرت اور عملیت (Practicability) کے تقاضوں پر بھی پورا اترتا ہے۔ اسلام جس قسم کی ہئیت اجتماعیہ قائم کرتا ہے وہ تمام تر ان ہی اصولوں پر مبنی ہے، طبیعت انسانی جن کا شعوری اور لاشعوری طور پر تقاضا کرتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد، قریبی ادوار میں مسلمانوں کی زبردست اور بے مثال سیاسی، معاشی، فکری اور تمدنی ترقیوں کی اصل وجہ یہی تھی کہ ان کا راستہ سیدھا، واضح اور متعین تھا، اس میں کسی قسم کے ابہام و ایہام یا شک و شبہ کا کوئی شائبہ تک نہ تھا، ان کو اپنے نصب العین پر کامل ایمان تھا، وہ اسلامی تعلیمات سے واقف تھے، وہ اسلامی تعلیمات و احکام پر اس لئے عمل کرتے تھے کہ خود ان کی خوبیوں اور خصوصیات و و ممیزات کا علی وجہ البصیرت علم رکھتے تھے، اسلامی تعلیمات پر ان کا یقین محکم اور عمل پیہم کسی جبر و اکراہ اور اسلامی ہئیت اجتماعیہ میں ان کی

شمولیت کسی زور و زبردستی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس کا اصل محرک ان کی اپنی دلی آرزوئیں اور قلبی خواھشات تھیں، ان کے اس عمل میں کسی پیر، مرشد یا امام کی تقلید اور پیروی کو کوئی دخل نہ تھا، وہ صرف ایک ھی مرشد، ایک ھی امام، اور ایک ھی مقتدا، کے پیروکار تھے اور اس اتحاد فکر و عمل نے ان میں ھر پہلو سے حیرت انگیز اتحاد اور بے نظیر یک رنگی کو جنم دے دیا تھا۔

اسلام نے دنیا کو جس نئے نظام زندگی سے آشنا کیا تھا وہ اپنی صورت میں جلوہ گر ھوچکا تھا، مسلمانوں کی انفرادی اور عائلی زندگی سے لے کر ان کی سیاسی تنظیم، ان کا حکومتی نظم و نسق، ان کا عدالتی نظام، ان کے عسکری انتظامات، ان کے ضوابط قانون اور ان کی اقتصادی و معاشی سرگرمیاں تمام تر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں، ان کی تہذیبی عمارت کی بنیادیں توحید، رسالت اور ایمان بالآخرت کے اصول سہ گانہ پر قائم تھیں، ان کا نظام اخلاق عدل و قسط، اخوت اسلامیہ اور تخلق باخلاق اللہ سے عبارت تھا، ان کا نظام معیشت و معاشرت صحیح معنوں میں مساوات محمدی کا آئینہ دار تھا۔

جب تک یہ صورت حال قائم رھی مسلمان نہ صرف سیاسی طور پر دنیا کے حاکم اور مقتدا رھے، بلکہ نظری اور عملی ھر دو اعتبار سے شہادت حق، امامت عالم اور خلافت ارضی کے اعلیٰ ترین فرائض بھی انجام دیتے رھے۔ تمدن آفرینی اور تخلیق آئین جہانداری میں ان کا کوئی مثیل نہ تھا، نظم و ضبط اور اصول کی پابندی ان کا طرہ امتیاز تھا، روئے زمین پر بہتر سے بہتر جس نظام معاشرہ کا تصور کیا جاسکتا ھے اس میں وہ زندگی بسر کرتے تھے۔

لیکن مرور ایام کے ساتھ ساتھ گوناگوں مصائب کے بے پناہ ھجوم نے مسلمانوں کو ان تمام خوبیوں سے خالی کرکے ان میں مختلف کمزوریوں اور

برائیوں کے بیج بونے شروع کردئے، آپس کے بیجا اختلافات، غیروں کی سازشوں اور یورشوں، اپنوں ہی کے برپا کئے ہوئے ہنگاموں، شورشوں اور دوستوں کے بے وفائیوں اور بدعہدیوں نے ان ننھے بیجوں کو تناور درخت میں تبدیل کرڈالا۔ چوتھی صدی ہجری آتے آتے یہ کیفیت ہوگئی کہ مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت سخت انتشار کا شکار ہوگئی، خلافت جیسے عظیم اور مرکزی ادارے کے متعدد دعویدار پیدا ہوگئے، خود مختار سلطنتوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، یونانی، ایرانی اور ہندی فلسفوں اور تصورات کے استیلاء اور یہودیوں کی خود ساختہ مذہبی داستانوں کے رواج نے اسلامی فکر کے چشمۂ صافی کو گدلا کرڈالا، فقہ کے جزئی اختلافات کو اس قدر شدید سے شدید تر کیا گیا کہ ان کو دینی اختلاف سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی، سوقع پرست قصہ گوؤں اور تنوع پسند واعظوں نے واہی تباہی قصوں اور خرافات کو تاریخ اور روایات کے نام سے سیدھے سادے مسلمانوں میں پھیلا دیا۔

فطرت کا یہ ایک عام اصول ہے کہ قوم کی ہر اخلاقی اور اجتماعی کیفیت کا اثر اس کی سیاسی صورت حال پر پڑتا ہے، اسی طرح کسی قوم کی سیاسی صورت حال اس کی اخلاقی اور اجتماعی کیفیت پر بھی لازماً اثر انداز ہوتی ہے۔ مسلمان اس کلیہ سے کچھ مستثنیٰ نہ تھے اور ہو بھی کیسے سکتے تھے، اس لئے کہ فطرت کائنات دراصل اللہ تعالی کی سنت کا دوسرا نام ہے ولن تجد لسنة اللہ تبدیلا . . ولن تجد لسنة اللہ تحویلا (اور تم اللہ تعالی کی سنت میں ہر گز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے . . . اور تم اللہ تعالی کی سنت میں ہر گز کوئی تغیر نہیں پاؤ گے)(۱) مسلمانوں کے اخلاقی اور اجتماعی انتشار کے ساتھ ساتھ فطرت کائنات کا یہ ابدی اصول بھی کارفرما رہا اور آخر کار وقعت الواقعة ! وہ حادثۂ فاجعہ رونما ہوا جس نے مسلمانوں کو من حیث القوم دنیا سے ختم کردینے میں

---

(۱) القرآن : فاطر ۴۳

برائیوں کے بیج بونے شروع کردئیے، آپس کے بیجا اختلافات، غیروں کی سازشوں اور یورشوں، اپنوں ہی کے برپا کئے ہوئے ہنگاموں، شورشوں اور دوستوں کے بے وفائیوں اور بدعہدیوں نے ان ننھے بیجوں کو تناور درخت میں تبدیل کرڈالا۔ چوتھی صدی ہجری آتے آتے یہ کیفیت ہوگئی کہ مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت سخت انتشار کا شکار ہوگئی، خلافت جیسے عظیم اور مرکزی ادارے کے متعدد دعویدار پیدا ہوگئے، خود مختار سلطنتوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، یونانی، ایرانی اور ہندی فلسفوں اور تصورات کے استیلاء اور یہودیوں کی خود ساختہ مذہبی داستانوں کے رواج نے اسلامی فکر کے چشمۂ صافی کو گدلا کرڈالا، فقہ کے جزئی اختلافات کو اس قدر شدید سے شدید تر کیا گیا کہ ان کو دینی اختلاف سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی، موقع پرست قصہ گوؤں اور تنوع پسند واعظوں نے واہی تباہی قصوں اور خرافات کو تاریخ اور روایات کے نام سے سیدھے سادے مسلمانوں میں پھیلا دیا۔

فطرت کا یہ ایک عام اصول ہے کہ قوم کی ہر اخلاقی اور اجتماعی کیفیت کا اثر اس کی سیاسی صورت حال پر پڑتا ہے، اسی طرح کسی قوم کی سیاسی صورت حال اس کی اخلاقی اور اجتماعی کیفیت پر بھی لازماً اثر انداز ہوتی ہے۔ مسلمان اس کلیہ سے کچھ مستثنیٰ نہ تھے اور ہو بھی کیسے سکتے تھے، اس لئے کہ فطرت کائنات دراصل اللہ تعالی کی سنت کا دوسرا نام ہے ولن تجد لسنة الله تبدیلا ... ولن تجد لسنة الله تحویلا (اور تم اللہ تعالی کی سنت میں ہر گز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے ... اور تم اللہ تعالی کی سنت میں ہر گز کوئی تغیر نہیں پاؤ گے)(۱) مسلمانوں کے اخلاقی اور اجتماعی انتشار کے ساتھ ساتھ فطرت کائنات کا یہ ابدی اصول بھی کارفرما رہا اور آخر کار وقعت الواقعة! وہ حادثہ فاجعہ رونما ہوا جس نے مسلمانوں کو من حیث القوم دنیا سے ختم کردینے میں

---

(۱) القرآن: فاطر ۴۳

کم از کم اپنی طرف سے تو کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، یعنی ہولاکو خان چنگیزی تاتار کے ہاتھوں بغداد تباہ و برباد ہوا، ادارۂ خلافت کی سیاسی حیثیت کا زوال جو معتصم عباسی (م ۲۲۷ھ) کے بعد ہی سے شروع ہوچکا تھا اپنی انتہا کو پہنچا، اور امیر المومنین مستعصم باللہ کو نہایت بے دردی اور توہین آمیز طریقے کے ساتھ قتل کردیا گیا۔ (سنہ ۶۵۶) اسی قیامت سے متاثر ہوکر شیخ سعدی (م ۶۹۱ھ) نے کہا تھا :

آسماں را حق بود گر خون ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین
دیدہ اے کہ دیدی شوکت بیت الحرام
قیصران روم سر بر خاک و خاقان بر زمیں
خون فرزندان عم مصطفیٰ شد ریختہ،
ہم بر آں جائیکہ سلطانان نہادندے جبیں
ای محمد گر قیامت سر برون آری ز خاک
سر برون آر وایں قیامت را میان خلق بیں (۲)

اس درد ناک اور تباہ کن صدمہ نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ان میں دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کا ولولہ بیدار ہوگیا۔ جلد ہی متعدد اصلاحی اور تجدیدی تحریکات انفرادی اور اجتماعی طور پر شروع کی گئیں جن کے ذریعہ احیائے اسلام اور مسلمانوں کی نشأت ثانیہ کے عظیم الشان مشن کی ابتدا ہو گئی۔ انفرادی سطح پر شیخ الاسلام علامہ احمد ابن تیمیۃ الحرانی (متوفی ۷۲۸ھ) حافظ ابن قیم الجوزیہ (متوفی ۷۵۱ھ)، علامہ ابن رجب (م ۷۹۵ ھ)، حافظ شمس الدین الذہبی (م ۷۴۸ھ)، مولانا جلال الدین رومی صاحب مثنوی (متوفی ۶۷۲ھ)، شیخ محمد بن یوسف بن عمروبن شعیب السنوسی (م

(۲) سعدی شیرازی : کلیات سعدی، مطبوعہ کتاب خانہ ابن سینا تہران، حصہ قصائد

۸۹۵ھ) شیخ نصیر الدین چراغ دھلی (م ۷۵۷ھ)، مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری (متوفی ۷۸۲ھ) اور شیخ احمد سرھندی فاروقی مجدد الف ثانی (م ۱۰۳۴ھ) کے علاوہ بہت سے دوسرے اکابرین نے اس مقدس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ دوسری طرف بعض جماعتی تحریکات بھی شروع ہوئیں جنھوں نے منظم ہوکر احیاء اسلام کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ان تحریکات میں سطح مرتفع اناضولو (Anatolia موجودہ ترکی کا ایشیائی حصہ) کی اخی تحریک کا نام قابل ذکر ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی ھجری کی اس نیم فوجی نیم صوفی دینی اسلامی تحریک نے ترک مسلمانوں کو متحد کرنے اور ان میں روح جہاد کو بیدار کرکے ان کو اقامت دین کے عظیم مقصد کے لئے تیار کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ خانوادہ عثمانی کے اولین دو فرمانروا سلطان عثمان خان اول (جس کے نام سے یہ خانوادہ منسوب ہے) اور سلطان اورخان بھی اس تحریک سے متاثرین میں تھے، بلکہ سلطان عثمان خان کو تو بعض مؤرخین نے اس تحریک کا باقاعدہ رکن بھی بتایا ہے(۳)۔ اس تحریک کے متعلقین خود بھی دین کی حفاظت اور بقاء کے لئے عملاً جہاد میں حصہ لیا کرتے تھے۔ جن جن علاقوں میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کے زوال کے نتیجہ میں افرا تفری پھیل جاتی وھاں یہ لوگ عارضی طور پر حکومتی نظم و نسق بھی قائم کر لیتے تھے اور آپس میں ھی سے کسی ایک شخص کو وقتی طور پر امیر منتخب کر لیتے تھے۔ مستقل طور پر حکومتیں قائم کرنا اور ان کو چلانا اس تحریک کے منصوبہ میں شامل نہ تھا۔ (۴)

مسلمان راھنماؤں کی یہ مخلصانہ کوششیں جلد ھی رنگ لائیں اور جلد ھی متعدد مضبوط و مستحکم حکومتیں بلاد اسلامیہ میں قائم ھوگئیں۔ اس سلسلہ میں ھندوستان میں خاندان بلبن، خاندان خلجی اور خاندان تغلق کی عظیم الشان

---

(۳) ڈاکٹر محمد صابر: ترکان عثمانی، جلد اول، طبع اول کراچی، ۱۹۶۷ صفحہ ۱۷

(۴) تفصیلات کے لئے دیکھئے ،، دائرۃ المعارف الاسلامیہ اردو مطبوعہ لاھور، جلد اول، مقالہ اخی تحریک؛ ترکان عثمانی مصنفہ ڈاکٹر محمد صابر، طبع کراچی ۱۹۶۷ جلد اول صفحات ۶۹-۷۱: ۷۵، ۱۰۱-۱۰۲

حکومتوں، دولت عثمانیه (خلافت سے پہلے، خلافت کے بعد کے دور کا ذکر آگے آرہا ہے) مصر کی سلطنت ممالیک، وسط ایشیا کی حکومتوں اور ایران و افغانستان میں تیموریوں کی سلطنتوں کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف مصر کے مملوک حکمران الملک الظاهرلدین الله رکن الدین بیبرس نے کوشش کی که سلسلۂ خلافت جو ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو حضور اکرم صلی الله علیه وسلم کی وفات طیبه کے فوراً بعد حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی الله عنه کی بیعت سے شروع ہوا تھا منقطع نه ہونے پائے۔ اس مقصد کے لئے بیبرس نے عباسی خانوادہ ہی کے ایک فرد ابوالقاسم کو مصر آنے کی دعوت دی۔ احمدابوالقاسم نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور اس کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ مصر لایا گیا، احمد کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی گی اور اس نے المستنصر باالله کا لقب اختیار کیا۔(۵)

مصر کی عباسی خلافت ۶۵۹ھ مطابق ۱۲۶۲ء سے لیکر ۹۳۲ھ مطابق ۱۵۱۸ء تک قائم رہی، اس دورکی کل مدت ۲۶۴ سال ہے، ۲۶۴ سال کے اس عرصه میں کل اٹھارہ خلفاء تخت نشین ہوئے، (۶) لیکن یه خلافت محض برائے نام ہی تھی، حکومتی معاملات میں کرتا دھرتا حکمران ممالک ہی ہوتے تھے۔ عباسی خلیفه کی حیثیت صرف تبرکاً یا موجودہ اصطلاح میں دستوری سربراہ کی تھی، اس کی ذمه داری صرف اس قدر ہوتی تھی که وہ رسمی طور پر ہر نئے سلطان کو خلعت اور سند حکمرانی عطا کر دیا کرتا تھا اور بس۔ بلکه اس سے بھی بڑھ کر بعض خلفاء کی حیثیت تو کم و بیش نظربندوں کی سی تھی، وہ نه اپنی مرضی سے کسی سے مل جل سکتے تھے نه کوئی اور بڑا کام کرسکتے تھے۔

---

(۵) حافظ ابوالفداءُ اسمعیل بن عمر بن کثیر الدمشقي: البداية والنهاية، جلد سیزدهم، مطبوعه مصر ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء، صفحات ۲۳۱ - ۲۳۲

(۶) شاہ معین الدین ندوی: تاریخ اسلام حصه چهارم خلافت عباسیه جلد دوم، اعظم گڑھ ۱۹۴۵ صفحات ۳۱۲-۳۳۲

یہ صورت حال ڈھائی صدی سے کچھ زیادہ مدت تک قائم رہی۔ اس دوران میں اناضولو میں قائم ہونے والی عثمانی ریاست جسے ترکوں کی نیم تاریخی نیم افسانوی شخصیت اوطغرل (متوفی ۶۸۸ھ مطابق ۱۲۸۹ء) نے قائم کیا تھا ترقی کر کے عالم اسلام کی سب سے طاقتور، مضبوط و مستحکم، وسیع، ترقی یافتہ اور تازہ دم حکومت میں بدل چکی تھی۔ سلطان ارخان بن سلطان عثمان خان (المتوفی ۷۷۰ھ مطابق ۱۳۶۹ء) سلطان بایزید یلدرم (دور حکومت ۷۹۲ مطابق ۱۳۸۹ء تا ۸۰۵ھ مطابق ۱۴۰۳) اور سلطان محمد الفاتح فاتح قسطنطنیہ (متوفی ۸۸۶ مطابق ۱۴۸۱ء) جیسے جلیل القدر سلاطین و فاتحین نے دولت عثمانیہ کو دنیا کی طاقتور ترین حکومت بنا دیا تھا۔ اس سلطنت کے حدود یورپ میں یونان بلغاریہ، البانیہ، سرویا، بوسنیا، اٹلی کے بعض علاقوں، ہنگری، کریمیا، اور ویانا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ایشیائی ممالک میں پورا ایشیائے کوچک، کردستان اور مغربی ایران کا وسیع رقبہ قلمرو عثمانی میں شامل ہو چکا تھا۔ اسی طرح براعظم افریقہ میں بھی عثمانیوں کا اثر و رسوخ بڑھتا ھی جارہا تھا اور اب تقریباً پورے کے پورے شمالی افریقہ پر صحرائے سینا سے لے کر مراکش تک عثمانی پھریرے لہرا رہے تھے۔

محرم ۹۲۳ھ مطابق فروری ۱۵۱۷ میں سلطان غازی سلیم اول نے مصر بھی فتح کر لیا۔ اس سے تقریباً ایک سال قبل ھی حماۃ، حمص، دمشق اور متعدد دوسرے قریبی علاقے بھی قلمرو عثمانی کا جزو ہوچکے تھے اور اسی سال اس کو خادم الحرمین الشریفین کا جلیل القدر اور ایمان افروز خطاب بھی حاصل ہو چکا تھا۔ اب ۹۲۳ھ میں خلافت بھی باقاعدہ طور پر اس خاندان میں منتقل ہوگئی اور آخری عباسی خلیفہ محمد المتوکل علی اللہ نے منصب خلافت سلیم کو سونپ دیا، قاہرہ ھی میں امیر المومنین سلیم عثمانی کی بیعت خلافت ہوئی، متوکل علی اللہ نے تمام تبرکات نبوی علم، تلوار اور رداء نبوی بھی نئے خلیفہ کے سپرد کردی،

حرمین شریفین کی کنجیاں بھی اس کے حوالہ کردی گئیں۔(۷)

عثمانی خاندان میں خلافت کی اس منتقلی سے ایک بار پھر چند صدیوں کے لئے خلافت اسلامیہ پوری آن بان کے ساتھ قائم ہوگئی اور دنیا کو ایک مرتبہ پھر اسوی خلافت کی شان و شکوہ کا نمونہ دکھاگئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ "اس وقت دنیائے اسلام کی خلافت کا حق بھی انہی کو پہنچتا تھا، کوئی دوسری اسلامی سلطنت طاقت و وسعت میں دولت عثمانیہ کے برابر نہ تھی، یہی سلطنت دوسری تمام سلطنتوں سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی تھی اور قریباً ڈیڑھ صدی سے جہاد کا فرض ادا کرتی آرہی تھی، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب سلطان سلیم کی خلافت کا اعلان کیا گیا تو دنیائے اسلام کے کسی گوشہ سے اس کی مخالفت نہیں ہوئی، اس منصب کے لئے سلاطین عثمان کا حق اس قدر مسلم سمجھا گیا کہ سلیم کے عہد سے لے کر گذشتہ جنگ عمومی تک پوری چار صدیوں میں ایک مدعی خلافت بھی ان کے مقابلہ میں نہیں اٹھا، بنو امیہ اور عباسیہ کے عہدوں میں خلافت کے بہت سے دعویدار نظر آتے ہیں لیکن خلفائے عثمانیہ کی پوری تاریخ میں کسی ایک حریف کو بھی سامنے آنے کی جرات نہیں ہوئی"(۸)۔

خلافت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ عظیم الشان ذمہ داری جو عثمانی خلفاء کے کاندھوں پر ڈالی تھی گئی انھوں نے بطریق احسن اس ذمہ داری کو ادا کیا اور جیسا کہ اقتباس بالا سے ظاہر ہے عالم اسلام میں کسی نے اس معاملے میں عثمانی خلفاء کی اہلیت کو کبھی چیلینج نہیں کیا۔ حرمین شریفین کی خدمت و حفاظت میں بھی خلفاء عثمانیہ نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ لوگ خادم الحرمین الشریفین کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے، ایک بار نماز جمعہ

---

(۷) محمد فرید بے: تاریخ الدولة العلیة العثمانیة، طبع دوم ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء، قاہرہ، صفحات ۷۵-۷۶

(۸) ڈاکٹر محمد عزیر: دولت عثمانیہ جلد اول، طبع دوم ۱۹۵۸ء، اعظم گڑھ، صفحات ۱۸۱-۱۸۲

کے موقع پر خطیب نے عثمانی خلیفہ کے لئے مالک الحرمین الشریفین کا لفظ استعمال کیا تو خلیفہ نے فوراً کھڑے ہوکر خطیب کو فہمائش کی اور کہا کہ میں صرف خادم الحرمین الشریفین ہوں(۹)۔

اگرچہ عباسیوں کے آخری دور کی طرح عثمانیوں کو بھی ان کے آخری دور میں اسلامی دنیا کے ایک معتدبہ حصہ پر کوئی سیاسی غلبہ یا قبضہ حاصل نہ تھا لیکن پھر بھی جذباتی طور پر خلافت عثمانیہ کو مسلمانوں کے مرکز اور ممالک اسلامیہ کی آخری پناہ‌گاہ کی حیثیت حاصل رہی۔ دنیا بھر کی مساجد میں جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں عثمانی خلیفہ ھی کا نام پڑھا جاتا، اس کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگی جاتیں، (بلکہ کہا جاتا ھے کہ پاک و ہند اور افغانستان وغیرہ کے بعض علاقوں میں اب تک خطبات جمعہ و عیدین میں عثمانی خلیفہ کا نام پڑھا جاتا ھے)(۱۰) ان کی عطا کردہ سندات کو تمغہ جات، طغروں اور خلعتوں کو اوروں سے زیادہ عزت و احترام بلکہ برکت کا مستحق اور سبب سمجھا جاتا۔ مسلمانان عالم اور بالخصوص برصغیر پاک و ہند کے آخری وقت (۱۹۲۴ میں تنسیخ خلافت) تک عثمانیوں ھی کو اپنا محافظ اور اسلام کا نگہبان سمجھتے رھے۔

اٹھارویں صدی شمسی میں مسلمانوں کی سیاسی قوت تیزی سے گھٹنا شروع ہوگئی۔ خلافت عثمانیہ بعض اندرونی اور بیرونی اسباب کی وجہ سے (جن کی مختصر تفصیل صفحات آئندہ میں آرھی ھے) کمزوری اور انتشار کا شکار ہونے لگی، مختلف علاقے ایک ایک کر کے عثمانی قلمرو سے الگ ہونے لگے، یہ کمزوری یہاں تک بڑھی کہ بالآخر ۱۸۴۴ء میں روس کے شاہنشاہ نکولس نے ترکی کو ’’مرد بیمار،، کا لقب دیدیا جو موجودہ صدی کے ربع اول تک بطور ایک

(۹) محمد کرد علی: الاسلام والحضارة العربية جلد دوم، صفحہ ۲۹۰، بحوالہ سعید احمد اکبرآبادی: مسلمانوں کا عروج و زوال طبع دوم دھلی ۱۹۴۷ صفحہ ۱۳۷

(۱۰) ڈاکٹر محمد صابر: حوالہ ما قبل، صفحات ۲۱-۲۳

سیاسی اصطلاح کے استعمال ہوتا رہا(۱۱)۔ دولت عثمانیہ کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی دول یورپ نے اپنے استعماری پنجے گاڑنے شروع کردئے۔ یہ لوگ تاجروں، سیاحوں اور مبلغوں کے بھیس میں مختلف اسلامی ممالک میں جا بستے اور مسلمانوں کی فطری نرم دلی، فیاضی اور مذہبی بردباری سے ناجائز طور پر فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پوزیشن مضبوط بنا لیتے اور پھر بالتدریج ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت ایک سیاسی قوت کی حیثیت اختیار کرلیتے، یہ کس قدر عجیب بات ھے کہ انگریز تاجروں کی وہ جماعت جس نے ھندوستان کے عظیم مغل فرمانروا محی الدین اورنگ زیب محمد عالمگیر (متوفی ۱۷۰۷ء) سے گڑ گڑا کر جان بخشی کرائی تھی اور تجارت کی اجازت حاصل کی تھی اس کی وفات کے بعد پچاس سال کے اندر اندر ھندوستان کی حکمران بن بیٹھی اور ابھی اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کو صرف ڈیڑھ سوسال ھی گذرے تھے کہ اسی اورنگ‌زیب کے جانشین پر اس الزام میں مقدمہ چل رہا تھا کہ اس نے ان بدیسی تاجروں کے تسلط سے آزاد ھونے کی کوشش کی تھی(۱۲)۔

یہ سلسلہ اٹھارویں صدی شمسی کے نصف اول سے بیسویں صدی شمسی کے اوائل تک جاری رہا۔ ان دو صدیوں میں مسلم اکثریت کا شاید ھی کوئی علاقہ ایسا ھوا جو اغیار کے قبضہ سے محفوظ رہا ھو، ورنہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اور قازقستان سے لے کر یوگنڈا تک کے وسیع ترین رقبہ پر پھیلی ھوئی ملت اسلامیہ کے بیشتر افراد مختلف یورپی طاقتوں کے پنجہ عبودیت میں جکڑ چکے تھے۔

---

(۱۱) نصیب اختر (مترجم) سلاطین ترکیہ از اسٹینلے لین پول، طبع دوم ۱۹۷۰ کراچی و ڈھاکہ، صفحہ ۲۸۲

(۱۲) اشتیاق حسین قریشی ، ڈاکٹر، The Muslim Community of Indo Pakistan Sub-Contiment مطبوعہ ھیگ، نیدر لینڈ ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۶۳